© rasailojaraid.com

اصلاح المسلمین کے زیر اثر اس کی تاسیس ہوئی تھی۔ یہ انجمن ۱۹۰۶ء میں اس دیار کے مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی اصلاح کے مقصد سے قائم کی گئی تھی۔ ان کی طالب علمی کا دور ۱۹۲۲ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور سے ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ اپنی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں یہ مدرسہ پوری طرح مولانا شبلی کے زیر اثر تھا اور یہاں ان کے تلامذہ کے ذریعہ ان کی تعلیمی پالیسی جاری اور نافذ تھی۔ مولانا کو ابتدا ہی سے اس مدرسہ سے گہری دلچسپی تھی لیکن ۱۹۱۳ء میں ندوہ کی معتمدی سے سبک دوشی اور وہاں اصلاح احوال سے مایوسی کے بعد انھوں نے اس طرف خاص توجہ دی۔ اس کے سلسلہ میں ان کا ایک خاص تخیل تھا جس کے مطابق وہ اس مدرسہ کی تعمیر و ترقی کے خواہاں تھے۔ وہ اسے گر وکل کے انداز کا ادارہ بنانا چاہتے تھے جو دین و دنیا دونوں کی تعلیم کا مرکز ہو۔ جہاں خدام الدین بھی تیار ہوں اور دین کی اعلی تعلیم بھی دی جائے اور جہاں سادگی، قناعت اور مذہبی خدمت مطمح نظر ہو۔

اس وقت مولانا شبلی کے سامنے ایک جامعہ اسلامیہ کی تاسیس کا نقشہ کار تھا جس کے دو اہم اجزاء دار المصنفین اور مدرسۃ الاصلاح تھے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بھی مرتب کر لیا تھا اور اس کے مطابق ضروری تیاریاں بھی کر رہے تھے۔ انتقال سے پہلے وہ مولانا فراہی کو جس طرح بار بار اس مدرسہ کی طرف توجہ دلا رہے تھے اور جس طرح انہیں حیدر آباد کی بیش قرار ملازمت کو خیر باد کہہ کر اس ابدی خدمت میں مصروف ہونے کی تاکید کر رہے تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے مستقبل کے منصوبوں میں اس مدرسہ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اس منصوبہ کو روبعمل لانے کے لیے انھوں نے اپنے دو خاص شاگردوں کو مدرسہ کی اہم انتظامی اور تدریسی خدمات کے لیے نامزد کیا۔ مولانا مسعود علی ندوی کو مدرسہ کے انتظامی امور کی دیکھ بھال اور مولانا شبلی ندوی متکلم کو تدریس کے لیے تجویز کیا گیا۔ لیکن اس تجویز کے بروئے کار آنے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے تجویز کردہ نقشہ کار کے مطابق مولانا مسعود علی ندوی کے ذمہ مدرسہ کی عمومی نگرانی اور مولانا شبلی ندوی متکلم کو صدارت تفویض کی گئی۔ مولانا مسعود علی ندوی تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ ہی دنوں بعد دارالمصنّفین کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے باعث اس خدمت سے سبک دوش ہو گئے لیکن مولانا شبلی متکلم نے مدت دراز تک اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا اور اپنے گرامی قدر استاذ کی تعلیمی پالیسی کو مدرسہ میں رائج ونافذ کیا۔ مزید برآں ابتدائی دنوں ہی میں مدرسہ کو مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی خدمات حاصل ہو گئی تھیں۔ مولانا نگرامی علامہ شبلی کے خصوصی تربیت یافتگان میں شامل تھے۔ ندوہ سے علیحدگی سے کچھ پہلے ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی نے اشاعت اسلام کے لیے کارکن تیار کرنے کے مقصد سے 'خدام الدین' کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کو اس قدر اہتمام تھا کہ جو طلبہ اس کام کے لیے تیار ہوئے ان کے والدین سے تحریری اجازت منگوائی۔ سادہ کھانا، سادہ پہننا، سادہ رہنا، زمین پر سونا، احکام اسلام کی پوری پابندی اور تقویٰ اور قناعت ان کی زندگی کا اصول بنایا گیا۔ جو سات طالب علم اپنی رضا اور رغبت سے اس انجمن میں داخل ہوئے مولانا نگرامی ان میں شامل تھے۔ اور اس باب میں ان کے جذبہ صادق کا حال یہ تھا کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی "انھوں نے بچپن میں مولانا کے ہاتھ جو عہد کیا تھا اس کو اخیر تک نبھایا، افسوس کہ جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گئے، اگر زندہ ہوتے تو مولانا کے حسن انتخاب کا زندہ پیکر ہوتے۔ خدام الدین کے باب میں مولانا کا جو تخیل تھا اس کا واضح پرتو مدرسۃ الاصلاح کے مقاصد میں نظر آتا ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس 'گروکل' کے طلبہ اور اساتذہ میں وہ انہیں اوصاف کی جھلک دیکھنا چاہتے تھے جنھیں انھوں نے خدام الدین کے ارکان کے لیے تجویز کیا تھا۔ اس پس منظر میں مولانا نگرامی کی مدرسۃ الاصلاح میں بحیثیت استاذ آمد خصوصی اہمیت کی حامل تھی۔

چنانچہ جب مولانا اصلاحی مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے اس وقت وہ پوری طرح مولانا شبلی کے خیالات ونظریات کے زیر اثر تھا اور ان کے تلامذہ کے ذریعہ وہاں ان کی تعلیمی پالیسی نافذ وجاری تھی۔ اسی ماحول میں ان کی علمی اور فکری صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور جن اساتذہ نے ان کی نشو ونما اور تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا وہ سب دبستان شبلی کے خصوصی تربیت یافتگان میں شامل تھے۔ ان کے فیض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تربیت سے دبستان شبلی کی امتیازی خصوصیات اور بہترین روایات ان کی شخصیت میں رچ بس گئیں۔ بالخصوص ان کی شخصیت پر مولانا نگرامی کی چھاپ بہت گہری تھی اور وہ ان کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت اور عقیدت سے کرتے تھے۔ ان کے زیر اثر مولانا اصلاحی کو نہ صرف علم وادب سے گہری دلچسپی پیدا ہوئی جس کا ان کی علمی اور تحقیقی مزاج کی صورت گری میں بہت بنیادی کردار رہا ہے بلکہ اس دور کے ہندوستانی سیاست کے رجحانات سے بھی آشنا ہوئے۔ اس سے ان کے مزاج میں وسعت وگیرائی اور فہم ونظر میں پختگی پیدا ہوئی۔ یہ ان کی ذہنی اور فکری تربیت کا پہلا مرحلہ تھا جو دبستان شبلی کی علمی، ادبی اور فکری روایات کے زیر اثر تکمیل پذیر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں دبستان شبلی کی بہترین روایات کا بھرپور انعکاس پایا جاتا ہے۔

یہ دراصل اس عظیم ذمہ داری کے لیے تیاری اور تربیت کا ایک حصہ تھا جو کارکنان قضاو قدر نے بحیثیت تلمیذ فراہی کتاب اللہ کی خدمت کی نسبت سے ان کے لیے مقدر کردی تھی۔ تفسیر وترجمانی قرآن کے جس عظیم منصب پر فائز ہونے کی سعادت ان کے لیے طے ہو چکی تھی اس کے لیے کچھ بنیادی ضروریات تھیں۔ جن کے بغیر اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مولانا فراہی کی تصنیفی زبان عربی تھی۔ فارسی کے وہ قادر الکلام شاعر تھے لیکن اردو سے ان کو کچھ زیادہ علاقہ نہ تھا۔ مولانا اصلاحی کو یہ کام اردو میں کرنا تھا اور جس معیار اور نوعیت کا یہ کام تھا اس کے لیے اردو زبان وادب پر پوری گرفت اور دسترس کی ضرورت تھی تاکہ دقیق ترین معانی ومفاہیم کی تفہیم وترسیل میں دشواری نہ ہو۔ مولانا کی تصانیف بالعموم اور "تدبر قرآن" بالخصوص جس اعلی ادبی معیار اور حسن زبان وبیان کی نشان دہی کرتی ہیں اس کی جڑیں دراصل مولانا کی زندگی کے اسی مرحلے میں تلاش کرنی چاہئیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مولانا فراہی سے کسب فیض کے لیے تیاری کا مرحلہ تھا۔ لیکن اس مرحلہ میں جو کچھ سیکھا تھا وہ زیادہ تر نظری معلومات تک محدود تھا۔ عملی تربیت کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔ ان کی تعلیم وتربیت کا یہ ابتدائی مرحلہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۲ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔

ان کی علمی زندگی کا دوسرا مرحلہ بجنور اور لکھنؤ سے وابستہ ہے۔ بجنور میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھوں نے اس زمانہ کے مشہور اخبار "مدینہ" کے نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ وہیں سے بچوں کا ایک ہفت روزہ رسالہ "غنچہ" شائع ہوتا تھا۔ کچھ دنوں اس کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ اس کے بعد وہ "سچ" کی ادارت سے وابستہ رہے جسے مولانا عبدالماجد دریابادی لکھنؤ سے نکالتے تھے اور جس نے "صدق" اور "صدق جدید" کے قالب میں اردو صحافت میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کیا۔ صحافتی مصروفیات کا یہ سلسلہ قریب ڈھائی تین سال تک جاری رہا۔ اس دور میں ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ اس طرح اپنے خیالات کو قرطاس و قلم کے وسیلہ سے موثر انداز میں دوسروں تک پہنچانے کی عملی مشق و تربیت ہوئی۔ مدینہ اور سچ کی پرانی فائلوں کو کھنگالا جائے تو غالباً یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس وقت ان کے رشحات قلم کا انداز و معیار کیا تھا اور ان کی علمی اور فکری سطح کیا تھی۔ بہر حال یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں الاصلاح کی ادارت کی ذمہ داری انھوں نے ایک نو آموز صحافی کی طرح نہیں بلکہ ایک کہنہ مشق اہل قلم کی طرح سنبھالی۔ الاصلاح کے صفحات میں بکھری ہوئی ان کی تحریریں اس کی شاہد عدل ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے زمانہ طالب علمی ہی میں مولانا حمیدالدین فراہی، حیدر آباد اور اس کی بیش قرار ملازمت کو خیرباد کہہ کر اس گوشہ فقر و قناعت میں مقیم اور اس ابدی خدمت میں مصروف ہو چکے تھے جس کی تاکید ان کے بڑے بھائی اور استاذ علامہ شبلی نعمانی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کرتے رہے تھے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں نوجوان امین احسن اصلاحی کی صلاحیتوں کا کسی قدر اندازہ بھی تھا۔ مدرسہ پر مولانا محمد علی کی آمد کے موقع پر حسن تقریر کے انعام میں ان کو اپنی کتابوں کا ایک سیٹ بھی عنایت فرما چکے تھے۔ لیکن غالباً اس وقت تک انھوں نے اپنے کسی ممکنہ جانشین کے انتخاب اور اس کی خصوصی تعلیم و تربیت کے بارے میں سوچنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کے ذہن میں اس مقصد کے لیے کوئی اور شخصیت رہی ہو۔ بہر حال مولانا فراہی سے تلمذ اور استفادہ کا سلسلہ طالب علمی کے اختتام اور دو تین سال کی صحافتی زندگی کے ایک مختصر وقفہ کے بعد شروع ہوا۔ گویا یہ بھی استاذ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گرامی قدر سے استفادہ کے لیے ضروری تیاری کا ایک حصہ تھا۔ مولانا فراہی سے استفادہ کا سلسلہ ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا اور ۱۹۳۰ء میں ان کے انتقال تک جاری رہا۔ یہ پانچ سال کا عرصہ مولانا اصلاحی کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اسی میں ان کی آئندہ زندگی کا رخ اور مقصد و نصب العین متعین ہوا جس کے حصول کی جدوجہد سے ان کی داستان حیات عبارت ہے۔ انھوں نے مولانا فراہی سے عربی ادب پڑھا، تاریخ پڑھی، فلسفہ پڑھا، اور ان سب سے زیادہ کتاب عزیز پر تدبر کے اصول و آداب سیکھے۔ ان سب مین ان کو اپنے عزیز رفیق درس مولانا اختر احسن اصلاحی کی رفاقت کی نعمت میسر تھی۔ عظیم المرتبت استاذ کو اپنی شام زندگی میں ایسے شاگرد میسر آگئے جن کو طمانیت قلب کے ساتھ وہ اپنا سرمایہ حیات سونپ سکتے تھے۔ راوی تو صرف یہ بتاتا ہے کہ پانچ سال تک عالی قدر استاذ کی نگرانی اور رہنمائی میں سعادت کوش شاگرد علم و دانش کے موتی چنتے رہے اور کتاب اللہ پر تدبر و تفکر کے رموز و اسرار سیکھتے رہے۔ لیکن قطرے کو گہر ہونے تک کن زہرہ گداز مراحل سے گزرنا پڑا اور کن ہفت خوانوں کو سر کرنا پڑا اس کا حال کون جانتا ہے۔

مولانا فراہی کے انتقال کے بعد اس فکری اور اصلاحی مشن کو اس کی صحیح روح کے ساتھ قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کی ذمہ داری بنیادی طور پر انہیں دو حضرات کی تھی۔ اس عظیم الشان مشن کی یوں تو کئی جہات تھیں لیکن چند امور خصوصاً فوری توجہ کے مستحق تھے۔ سب سے اہم کام یہ تھا کہ مولانا فراہی کی جو کتابیں مکمل تھیں اور ہنوز شائع نہیں ہو سکی تھیں ان کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔ نامکمل کتابوں کی تکمیل کی صورت کی جائے اور ان کے متعین کردہ خطوط پر اس کو آگے بڑھانے کے منصوبے بنائے جائیں۔ ان کی علمی میراث اور اصلاحی مشن کا ایک اہم حصہ تھا اور اس کی تعمیر و ترقی ان کے فکری وارثین کی ایک بڑی ذمہ داری تھی۔ اس کے علاوہ مولانا کی تقریباً تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں۔ بر صغیر کے عام پڑھے لکھے مسلمانوں کو اس علمی میراث سے متعارف کرانے اور ان کے لیے اس سے استفادہ کی راہ ہموار کرنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ان کتابوں کو اردو کا قالب عطا کیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان مقاصد کے حصول کے لیے ۱۹۳۶ء میں دائرہ حمیدیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس کے روح رواں مولانا اصلاحی تھے۔ یہ چند سال کا عرصہ خصوصاً جب تک الاصلاح نکلتا رہا اس درس گاہ کا عہد زریں تھا۔ اس مختصر عرصے میں وسائل کی غیر معمولی قلت کے باوجود جس کے باعث بالآخر الاصلاح کو بند کر دینا پڑا، ان مختلف محاذوں پر جتنا کچھ کام ہوا وہ آئندہ کئی دہوں میں ممکن نہیں ہو سکا۔ ایک طرف طلبہ کی علمی، ذہنی اور فکری تربیت ہو رہی تھی اور انھیں اس انقلابی فکر کے حاملین کی حیثیت سے تیار کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف مولانا فراہی کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام ہو رہا تھا تیسری طرف ان کی تصانیف کو اردو کا قالب عطا کیا جا رہا تھا۔ اور وہ بھی ایسا قالب کہ ترجمہ پر اصل کا گمان ہو۔ مطالب کی ادائیگی، زبان وبیان کی بے ساختگی اور شگفتگی، اسلوب کی دلآویزی، غرض جس پہلو سے دیکھیے کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ دانش جویوں کی ایک پوری ٹیم مولانا فراہی کے افکار و تحقیقات کی توضیح و تشریح اور اس کے مقصد و منشاء کے مطابق تحقیق و جستجو میں مصروف، اور اس قافلہ علم و فضل کے سالار کا نام امین احسن اصلاحی تھا

ان علمی و فکری کاموں کے دباؤ میں بھی اور مختلف النوع مصروفیات کی بوجھ کے باوجود وہ بنیادی کام فراموش نہیں کیا گیا جس کے لیے انجمن اصلاح المسلمین کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اگر گرد وجوار میں رہنے بسنے والے مسلمانوں کو اس مدرسہ سے کوئی فیض نہ پہنچتا اور ان کی معاشرت پر اس اصلاحی مشن کے اثرات مرتب نہ ہوتے تو یہ دراصل مدرسہ کی تاسیس کے پیچھے کار فرما بنیادی مقصد سے پہلو تہی اور بے اعتنائی کے مترادف ہوتا۔ چنانچہ اصلاح معاشرہ کا کام بھی اسی جوش وجذبہ سے جاری رہا۔ اعظم گڑھ اور جونپور کے مختلف علاقوں میں دورے ہوتے، جلسے منعقد کئے جاتے، تقریریں ہوتیں اور قوم کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جاتا۔ اس خطہ کے ایک بڑے حصے سے بدعات کا یکسر خاتمہ جو معاشرہ کے رگ وریشہ میں سرطان کی طرح پیوست ہو چکی تھیں، ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اس جدو جہد میں بھی مولانا اصلاحی نے بہت اہم کردار ادا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا۔ وہ بڑے بلند پایہ خطیب اور مقرر تھے۔ جب بولتے تو سماں بندھ جاتا۔ لوگ دور دور سے ان کی تقریر سننے آتے۔ انھوں نے اس صلاحیت کو دین مبین کے چہرہ انور پر پڑی گرد کو صاف کرنے میں صرف کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ کتاب اللہ کو پڑھنے پڑھانے والے اس کے اصلاحی اور تبلیغی مطالبات سے کیوں کر غافل ہو سکتے تھے۔

اس دور میں مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ایک اور شخصیت کی کوششوں کا دخل رہا ہے اور اس کے ذکر کے بغیر یہ داستان عزیمت ادھوری رہے گی۔ یہ شخصیت ان کے رفیق درس اور صدیق حمیم مولانا اختر احسن اصلاحی کی ہے دونوں زمانہ طالب علمی کے ہم درس تھے۔ مولانا فراہی سے دونوں نے ساتھ استفادہ کیا اور دونوں ہی ان کے فکری وارث قرار پائے۔ جب دائرہ حمیدیہ قائم ہوا تھا تو مولانا کی تصانیف کی ترتیب و تہذیب کی ذمہ داری مولانا اختر احسن اصلاحی کے سپرد کی گئی تھی۔ دونوں مزاج اور افتاد طبع میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے لیکن جو یکانگت، محبت اور اخلاص ان کے درمیان پایا جاتا تھا اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ مولانا اختر احسن اصلاحی جس خاموش اور غیر محسوس طریقے سے مولانا امین احسن اصلاحی کے علمی اور فکری کاموں کے لیے راہ ہموار کرتے رہے اور اس کے لیے ضروری ساز و سامان فراہم کرتے رہے وہ اس داستان کا ایک روح پرور باب ہے۔ ایک طرف تو انھوں نے مولانا اصلاحی کو روز مرہ کے بنیادی مسائل اور ضروریات سے یکسر مستغنی کر دیا۔ اور ان کو خالص علمی اور فکری کاموں کے لیے فارغ کر دیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے، نفاست پسندی ان کی طبیعت کا ایک حصہ تھی۔ چنانچہ یہ انتظامات ان کے مزاج اور معیار کے مطابق کیے جاتے تھے۔ جاننے والے بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح ان کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ اسی طرح ان کے علمی اور تحقیقی کاموں میں بھی ان کی مدد اور راہنمائی کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی حیثیت ایک رفیق و دمساز اور صدیق حمیم کے علاوہ راہنما اور استاذ کی بھی تھی۔ مولانا اصلاحی کو ان کی اس حیثیت کا اعتراف بھی تھا۔ چنانچہ جب تک وہ مدرسۃ الاصلاح میں رہے، شاید ہی ان کی کوئی تحریر مولانا اختر احسن اصلاحی کی نظروں سے گزرے بغیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشاعت کے لیے گئی ہو۔ ان کی اصلاحات کو وہ بخوشی قبول کرتے تھے۔ ان کی تجاویز پر پوری توجہ دیتے اور ان کے مطابق ضروری ردوبدل اور حک واضافہ کرتے۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں مولانا اختر احسن اصلاحی کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مدرسۃ الاصلاح پر بحیثیت مدرس مولانا امین احسن اصلاحی کا قیام ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۳ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جب مولانا دوبارہ مدرسہ میں آئے تو مولانا فراہی کو مدرسہ کا نظم ونسق سنبھالے ہوئے تقریباً پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اور وہ اپنے علمی اور فکری کاموں کے ساتھ ساتھ اس مدرسہ کو ایک مخصوص جہت دینے میں مصروف تھے۔ ۱۹۳۰ء میں وفات سے پہلے انھوں نے اس سلسلہ کا بنیادی کام پورا کر لیا تھا۔ اس کے اغراض ومقاصد کا تعین ہو چکا تھا، نصاب تعلیم متعین اور نافذ ہو چکا تھا۔ ان کی نگرانی میں اساتذہ کی ایک ٹیم تیار ہو چکی تھی۔ اور کم از کم اپنے دو تلامذہ کی اس حد تک تربیت کر چکے تھے کہ ان کے بعد ان کے قرآنی فکر کی آبیاری کر سکیں اور فہم قرآن کی اس روایت کو آگے بڑھا سکیں جس کی تنقیح و تنظیم کی سعادت ان کو میسر ہوئی تھی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اس فکری امانت کی توسیع واشاعت کے ساتھ ساتھ خود مدرسہ میں اس فکر کی اساس کو اتنا استوار اور پختہ کر دیا جائے کہ وہ اس کے تشخص کا ایک حصہ اور اس کی شناخت بن جائے۔ اس مشن کی تکمیل میں مولانا امین احسن اصلاحی کا بڑا حصہ رہا ہے۔ وہ مخصوص علمی وفکری فضا، وہ ذہنی اور عقلی ترجیحات اور رویے، وہ سوچنے اور سمجھنے کا خاص انداز، وہ رہن سہن کا خاص طریقہ اور سلیقہ اور وہ مخصوص روایات جن سے دراصل یہ مدرسہ عبارت ہے اور جو نصف صدی سے زیادہ سے اس کی شناخت بن چکی ہیں، ان کی صورت گری میں مولانا امین احسن اصلاحی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح نہ ہوتا تو امین احسن وہ نہ ہوتے جو ہوئے۔ امین احسن نہ ہوتے تو مدرسۃ الاصلاح وہ نہ ہوتا جو وہ تھا اور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مدرسہ سے رخصت ہوئے تو یہاں کی رونق محفل بھی رخصت ہو گئی۔ اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔ مدرسۃ الاصلاح کے درودیوار اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جدائی کا کرب مدتوں محسوس کرتے رہے۔

جماعت اسلامی سے مولانا کی وابستگی ۱۷ طویل سالوں پر محیط ہے اس پورے عرصے میں وہ مولانا مودودی کے بعد جماعت اسلامی کے سب سے اہم قائد تھے، اس طویل مدت کی وابستگی کے دوران وہ جماعت کے اعلیٰ ترین پالیسی ساز اداروں کے اہم ترین ارکان میں شامل رہے۔ نائب امیر اور امیر جماعت کی غیر حاضری میں امیر کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ جماعت کی فکری اور علمی قیادت کے میدان میں کلیدی کردار ادا کیا۔ فکری محاذ پر جماعت پر ہونے والے حملوں کا موثر دفاع کیا۔ جماعت کی نشو ونما اور تعمیر وترقی میں مولانا کا بڑا حصہ رہا ہے۔ آج بھی ان کی کتابیں تحریک اسلامی کے کارکنوں کو فکری غذا فراہم کرنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ دعوت دین اور اس کا طریقہ کار اور تزکیہ نفس جیسی کتابوں کی اسلامی لٹریچر میں مثال ملنی مشکل ہے اور تحریک اسلامی پر ان کے دور رس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اسی طرح خود مولانا کی تحریروں میں تحریک اسلامی کے اثرات کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ بالآخر جماعت اسلامی سے الگ ہوگئے لیکن اس طویل رفاقت کے اثرات سے ان کے افکار و نظریات کا متاثر ہونا ایک فطری امر ہے۔

مولانا نے اپنی زندگی کے بہترین ماہ وسال جماعت کی خدمت میں صرف کئے۔ یہ وہ وقت تھا جب قویٰ میں اعتدال تھا، جسم میں توانائی تھی۔ جب وہ جماعت سے الگ ہوئے تو ان کی عمر ۵۵ کے پیٹے میں تھی جب قویٰ میں اضمحلال کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ یوں تو وہ اپنی زندگی کے بنیادی مشن سے کبھی بھی یکسر غافل نہیں رہے۔ اور ان کے اوپر کوئی ایسا وقت نہیں گذرا جب وہ قرآن مجید پر تدبر و تفکر کے خوگر و دلدادہ نہ رہے ہوں لیکن یکسوئی اور فراغ خاطر جو ایسے مہتم بالشان کام کے لئے شرط اول ہے میسر نہیں تھا۔ اور جب تمام علائق سے یکسو ہو کر اپنی زندگی کے اصل مشن کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے تو آفتاب حیات نصف النہار سے گزر چکا تھا۔ اور وہ عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے تھے جہاں لوگ آئندہ کی ریٹائرڈ زندگی کے منصوبے بناتے ہیں۔ اس کام کی خاطر مولانا نے جو ہفت خواں سر کئے وہ ہر دو کس و ناکس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مقدر نہیں۔ ضعف، بیماری، ناداری، جور اغیار، کیسے کیسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جائیں لیکن اس کوہ وقار کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ نظریں منزل پر جمی رہیں۔ ظاہری اسباب ووسائل کے فقدان کے باوجود قدم آگے بڑھتے رہے۔ کام کی اہمیت وضرورت میں غیر متزلزل ایقان حوصلہ بڑھاتا رہا اور فضل ایزدی کی دستگیری سے منزل مراد تک پہنچنے کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ شاہ کار وجود میں آیا جسے دنیا ''تدبر قرآن'' کے نام سے جانتی ہے اور جسے تاریخ تفسیر میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے۔ مولانا فراہی کے وضع کردہ اصول اور منہج کے مطابق یہ تفسیر لکھ کر انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ تصور نظم قرآن صرف ایک نظری فلسفہ نہیں ہے بلکہ ایک قابل عمل نظریہ ہے اور اس کے وسیلہ سے قرآن کے ایسے معارف وحکم تک رسائی حاصل ہوتی ہے جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔ مولانا اصلاحی کی مدۃالعمر کی ریاضت کا یہ ثمرہ نہ صرف نظریہ نظم قرآن کا ایک ماڈل فراہم کرتا ہے بلکہ اس فرض کی ادائیگی کا بھی مظہر ہے جو مولانا فراہی کے شاگرد رشید ہونے کی حیثیت سے ان کے اوپر عائد ہوتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انھوں نے حق ادا کردیا۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

تدبر قرآن کے علاوہ بھی جو دراصل ایک کتاب نہیں بلکہ ایک دائرہ معارف ہے، مولانا امین احسن اصلاحی نے متعدد دینی اور علمی موضوعات پر نہایت وقیع اور گراں قدر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جو اپنے موضوع پر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی اصل اہمیت یہ ہے کہ ان سب کی اساس بے آمیز قرآنی تعلیمات پر رکھی گئی ہے۔ لیکن یہاں نہ تو تدبر قرآن کا کوئی تجزیہ مقصود ہے اور نہ ان کی دوسری کتابوں کا تعارف۔ یہ سب اور مولانا کی حیات وخدمات سے متعلق دوسرے موضوعات اور مباحث کے بارے میں انشاء اللہ اس خاص نمبر میں شامل مضامین ومقالات سے کسی حد تک معلومات حاصل ہوسکیں گی۔

صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی کے نام کے ساتھ مخصوص اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شمارے کو پیش کرتے ہوئے ہم بے پایاں مسرت محسوس کر رہے ہیں۔ مولانا کے انتقال کے بعد ہم نے ان کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ آج ہم اس سے عہدہ برآ ہوتے ہیں گو کہ غیر معمولی تاخیر کے ساتھ۔ اس کے لیے ہماری کوتاہیوں کے علاوہ بعض ایسے عوامل بھی ذمہ دار ہیں جو ہمارے اختیار سے باہر تھے۔ اس سلسلہ میں جن تلخ تجربات سے ہم کو گزرنا پڑا ان کے ذکر سے ہم آپ کو بدمزہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں پورا احساس ہے کہ اس کے لیے آپ کو طویل اور صبر آزما انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ اس کے لیے ہم صمیم قلب سے معذرت خواہ ہیں۔

ہم کو اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ جس انداز اور معیار پر اس خصوصی شمارہ کو ترتیب دینا چاہتے تھے ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ مضامین میں وہ تنوع نہیں جس کے ہم خواہش مند تھے۔ ہماری کوشش تھی کہ مولانا کی علمی اور فکری زندگی کے تمام ممکنہ گوشوں پر اس شمارہ میں سیر حاصل بحث ہو اور ان کی سوانح حیات کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ لیکن اس کوشش میں ہم کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ بہر حال بمصداق مالایدرک کلہ لایترک بعضہ جو کچھ بن سکا وہ پیش خدمت ہے۔

ہم بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہیں کہ اس کی کتاب کے ایک خادم کی نسبت سے ہماری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، اس سے مولانا کے علمی، فکری اور دینی ورثہ کو سمجھنے میں مدد ملے اور رجوع الی القرآن اور فہم قرآن کی راہ ہموار ہو جو مولانا کی زندگی کا مشن تھا۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم

۲۷ / نومبر ۲۰۰۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیر تدبرِ قرآن کی بعض امتیازی خصوصیات

محمد فاروق خاں

تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی مشہور و معروف تفسیر قرآن ہے۔ یہ تفسیر اس تدبر و تفکر کی آئینہ دار ہے، جو مولانا علیہ الرحمہ کی زندگی کا سب سے محبوب مشغلہ رہا ہے۔ قرآن کی طرف سے مولانا کہیں غافل نہیں رہے۔ غور و فکر کے ذریعہ سے وہ اپنے خزانے علم میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ اپنے استاذ گرامی امام حمید الدین فراہی سے قرآن کا جو علم انھوں نے حاصل کیا اس کی قدر و قیمت ان کی نگاہ میں تھی۔ پھر بھی استاذ کی ہر تحقیق کو انھوں نے حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ اسی لئے اپنے استاذ کی جن رایوں سے وہ مطمئن نہیں ہو سکے ہیں ان رایوں سے اپنے اختلاف کا اظہار بھی کیا ہے۔

مولانا قرآن کی عام رائج تفسیر کی کتابوں سے مطمئن نہیں تھے۔ انکے نزدیک تفسیر کا معیار جس درجہ بلند ہونا چاہئے اس کا لحاظ رکھنے سے بالعموم مفسرین قاصر رہے ہیں معیار کو بلند نہ رکھ سکنے کے وجوہ و اسباب بھی ہیں جن کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ کلام خداوندی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ شاہانہ ذوق و مزاج ہمارے سامنے رہے۔ تنگ دلی اور فکری افلاس اور کسی قسم کی ذاتی یا گروہی عصبیت کے ساتھ اگر ہم قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو قرآن کا صحیح فہم ہمیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر ہم اس چیز کو وزن نہیں دیتے کہ قرآن ایک منظم کلام ہے اور اس کو اہمیت نہیں دیتے کہ قرآن کی آیات کے درمیان گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے تو قرآن فہمی کی اصل کلید ہی ہم سے کھو جائے گی۔ اس طرح حکم اور معارف کا بڑا حصہ جو نظم کلام کے ذریعہ سے ہم پر کھل سکتا ہے اس سے ہم محروم ہی رہیں گے۔ پھر قرآن

© rasailojaraid.com